مہناز انجم

اسکالر پی ایچ۔ڈی (اُردُو)، ماہرِ مضمون (اُردُو)، قائدِ اعظم اکیڈمی فار ایجو کیشنل ڈویلپمنٹ، ایچ/۹، اسلام آباد

ڈاکٹر محمود احمد کاوش

پرنسپل قائد، نارووال

پاکستان اور بھارت کی نثری نظم کا فکری و موضوعاتی مطالعہ: اشتراکات و اختلافات

Mahnaz Anjum
Scholar PhD Urdu,Subject Specialist (Urdu) QAED, H/9, Islamabad.
Dr. Mehmood Ahmed Kavish
Principal QAED, Narowal.

Thematic Study of Pakistani and Indian Prose Poem: Commanalities and Dissimilarities

The effect of the political, social, cultural and geographical conditions is depicted in the writings of any writer. Prose Poem written after the partition of sub-continent Indo-Pak is the subject of this article. It aims at highlighting the point how the different conditions prevailing in both the countries have had their impact on the poets of prose poem. For this purpose, prose poems of the representative poets belonging to Pakistan and India are presented here. A comparative study is made to bring to light the thematic Commonalities and dissimilarities of the prose poem written by the poets of both the countries.

Key Words: *Prose Poem, Partition of Sub-continent, Comparative Study, Commonalties, Dissimilarities*

(الف) پاکستانی نثری نظم کا فکری اور موضوعاتی مطالعہ

برصغیر کی تقسیم سے بھارت اور پاکستان میں تخلیق کیے جانے والے ادب کی تمام اصناف میں فکری اور فنی، ہر دو سطح پر، تبدیلی واقع ہوئی۔ اس کی ایک وجہ تقسیم کے بعد دونوں ملکوں کے سیاسی، سماجی اور ثقافتی حالات میں پیدا ہونے والا فرق بھی ہے۔ زیرِ نظر مقالے کا موضوع پاکستان اور بھارت میں لکھی جانے والی نثری نظم ہے۔ دونوں ملکوں کے نمائندہ نثری نظم کے شاعروں کی تخلیقات کے حوالے سے تقابلی مطالعہ کیا جائے گا اور فکری و

موضوعاتی رنگارنگی کا مطالعہ کرتے ہوئے پاکستان اور بھارت میں لکھی جانے والی اُردو نثری نظم کے اشتراکات و اختلافات سامنے لائے جائیں گے

قمر جمیل پاکستان میں نثری نظم کے بنیاد گزاروں میں سے ہیں۔اُن کی نظموں کے موضوعات دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک ایسے شاعر ہیں جن کے زیادہ تر موضوعات جنگل، جنگل کی زندگی، آزاد منش لوگ اور فطری زندگی ہیں۔اُن کی چند نظموں کے عنوانات دیکھیے:

"جپسی گرل"، "شکاری جنگل سے واپس آگئے ہیں"، "جنگلی لڑکی"، "درویش"، "خانہ بدوش"، "پہاڑ کی آخری شام"، "مجذوب"، "گھوڑے"، "شہ سواروں کے نام"، "جنگلی لڑکیوں کے نام" وغیرہ۔اشہروں میں رہنے والے اور مصنوعی زندگی گزارنے والے لوگوں کو بھلا کیا معلوم کہ جنگل میں زندگی گزارنے والی ایک جنگلی لڑکی کیسی نظر آتی ہے،اُس کی زندگی گزارنے کا رنگ ڈھنگ کیسا ہے۔شاعر نے ایسی لڑکیوں کو فطرت کی طرح معصوم اور حرص و ہوس سے پاک قرار دیا ہے۔ شاعر ان لڑکیوں کے نازِ حسن اور پاکیزگی بر قرار رہنے کی دُعا بھی کرتا ہے۔ساتھ ہی ساتھ وہ اُن کو نصیحت بھی کرتا ہے کہ اُنھیں شہروں میں نہیں رہنا چاہیے۔شہروں میں بہت سے جسموں کے پجاری اُن کی پاکیزگی اور معصومیت کے دُشمن ہیں نیز جوانی اور خوب صورتی ویسے بھی بدنامی کے علاوہ کچھ نہیں۔ نظم "جنگلی لڑکیوں کے نام" کی یہ سطریں ملاحظہ ہوں:

> اے جنگلی لڑکیو! / بستر کے شکاریوں سے ہوشیار رہنا / خدا کرے تمھاری جوتیاں / غرور کی مٹی سے ہمیشہ بھری رہیں / جسم کی سچائیاں بھی / آخر اک چیز ہیں / اے جنگلی لڑکیو / تمھارا حسن / جنگل کی کالی افواہوں سے زیادہ / کچھ نہیں / دیکھو ناریل کا درخت تمھارے آگے جھکا ہوا ہے / میں اپنے دل کی مٹی میں / ایسا پھول لگانا چاہتا ہوں / جس میں ہر سال تم اگتی ہو / غیر انسانی سائیکلون / انسانی آسمانوں کا تعاقب کر رہے ہیں / اے جنگلی لڑکیو / جاؤ شہر سے واپس چلی جاؤ[(۱)]

یوں لگتا ہے قمر جمیل کو خانہ بدوشوں کی زندگی سے ایک خاص طرح کا شغف تھا۔اُن کی ایک اور نظم کا عنوان بھی "خانہ بدوش" ہے۔اِس نظم میں بھی وہ خانہ بدوشوں سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ اگر تم اپنا دُکھ جنگل کے درختوں اور سرخ چناروں کے سامنے بیان کرو گے تو یہ تمھارا غم نہ صرف سنیں گے بلکہ تمھاری دِل جوئی بھی کریں گے۔

قمر جمیل کی بعض نظموں میں ہندو مت، بدھ مت اور اسلامی فلسفے کی روایات کا حوالہ بھی موجود ہے۔ اُن کی نظم "سپر مارکیٹ" اِس کی ایک مثال ہے جس میں گوتم بدھ کا کردار پیش کیا گیا ہے۔ نظم میں گوتم کے کردار

کے حوالے سے دانش کے بعض اقوال بیان کیے گئے ہیں۔اسی نظم میں آگے چل کر مسولینی،رومن جرنیلوں، کلوپٹرا، انتونی، صوفیہ اور لائیکا جیسے کرداروں کا ذکر ہے۔

انیس ناگی کی نثری نظموں میں جدید دور کے انسان کے مسائل، دم توڑتے کلچر، خوابوں کی شکست و ریخت، تیسری دُنیا کے ممالک کے مسائل اور رُوحانی تقاضوں سے انحراف جیسے موضوعات ملتے ہیں۔ انیس ناگی نے اپنی نثری نظموں میں جدید صنعتی شہروں کے مسائل کو بھی اپنی نظموں کا موضوع بنایا ہے۔ مشینوں کے ساتھ زندگی گزارتے گزارتے انسان بھی مشین بن گئے ہیں۔ جدید دور بے حسی کا دور ہے۔ احساسِ مروت دم توڑ چکا ہے۔ مکاری عام ہو چکی ہے۔ ہر شخص اپنے آپ میں گم ہے۔ ایک نظم ''وہ ہاتھ کل جو'' میں اُنھوں نے اُن ہاتھوں کا ذکر کیا ہے جو کل باپ نے اُن کو دِیے تھے۔ ان کنوارے ہاتھوں سے وہ پتھروں کو کاٹتے، آبشاروں سے گزرتے، جنگلوں میں غیب کی آواز سنتے، سانپ کی مانند چلتے راستوں سے گزر کر صنعتی شہروں کی رونق میں گیا۔ اب شاعر کے اپنے لفظوں میں دیکھیے کہ وہ کیا اثاثہ لے کر شہر میں گیا، اُس نے شہر میں کیا دیکھا، اُس پر کیا گزری اور آخرِ کار اُس نے کیا فیصلہ کیا:

> تعلیم، نیکی اور دیانت کا ہنر میرے لہو میں تھا / مگر میں اجنبی تھا / شہر میں ہر شخص اپنے آپ میں گم / دُوسروں سے دُور تھا / سب موسموں کی دھول میں / میں اِک ہتھوڑے کی طرح سر پھینک کر / ہر دھات کا سینہ کچلتا تھا / کبھی ہاتھوں پہ اُگتے آبلوں کو دیکھ کر / یہ سوچتا تھا / اے خدا میری دیانت اور ہنر، تعلیم کے سولہ برس / ان سنگ دِل مکار لوگوں کے شکم میں کھو گئے / اس طرح فٹ پاتھ پر دورانِ سر کے ساتھ / میں نے عورتوں اور بکریوں کو رسم کی قربان گاہوں پر / خمیدہ سر، چتا میں جلتے دیکھا / دفتروں میں مطلبی اور دولسانی افسروں کو / اہل کاروں کو بگڑتے دیکھ کر / چپ چاپ میں نے جنگلوں کی راہ لی۔ (۲)

''روشنیاں'' انیس ناگی کی نمائندہ نظموں میں سے ایک ہے۔ اس نظم میں وہ بیان کرتے ہیں کہ تیسری دُنیا کے مجبور و مظلوم ممالک ترقی یافتہ اور نام نہاد مہذب ممالک کی دست نگر بلکہ غلام ہیں۔ دیہات سے شہروں کو نقل مکانی آج کے دور کا ایک بہت بڑا مسئلہ ہے۔ کم و بیش ہر شاعر نے اس مسئلے کو اپنی نظموں کا حصہ بنایا ہے۔ انیس ناگی نے بھی اس مسئلے پر قلم اُٹھایا ہے۔ انیس ناگی نے ''لینڈ سکیپ'' میں اسی مضمون کو سمویا ہے۔

انیس ناگی کی بعض نظمیں چونکا دینے والی ہیں۔ سائنس کی بے پناہ ترقی کے باوصف کوئی ایسا آلہ ایجاد نہیں کیا جا سکا جو انسان کے فکر و خیال تک ہمیں رسائی دے سکے۔ زمانۂ قدیم کی تہذیبوں کے کھنڈرات سے اُن کی

مادّی زندگی کے بارے میں تو جان کاری ملتی ہے لیکن اُن کے جذبات و احساسات جانچنے کا کوئی وسیلہ ہمارے پاس موجود نہیں۔" ایک نظم" میں انیس ناگی نے اسی سوچ کو لفظوں کا جامہ پہنایا ہے۔

احمد ہمیش کی نثری نظموں کے موضوعات عمومی شاعری کے موضوعات سے مختلف نہیں۔نہ ہی ان موضوعات میں غیر معمولی فکر کی کھوج لگائی جاسکتی ہے۔ان کی نظم "کچھ چیزیں مجھ سے باتیں کرتی ہیں" میں نہایت سادگی سے جدائی کے جذبے کا اظہار کیا گیا ہے۔محبت میں جب دو دِل جڑتے ہیں تو ایک یک جائی کی سی کیفیت بن جاتی ہے۔ایسے میں جب جدائی کا موسم آتا ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ کچھ توڑ پھوڑ اور دَرد کی سی کیفیت ہے۔یہ نظم محبت کے تعلق میں ٹوٹنے کی کیفیت کا اظہار ہے۔ نظم کے درجِ بالا عنوان کے ساتھ ایک ذیلی عنوان "چائے کی ٹوٹی پیالی" بھی درج ہے۔ نظم دراصل اسی عنوان کے ساتھ اپنی معنویت اجاگر کرتی ہے کیوں کہ نظم کا متکلم یہی ٹوٹی ہوئی پیالی ہے۔ نظم ملاحظہ کیجیے:

> مجھے اٹھالو / مجھے کسی یادگار جگہ پر رکھ دو / میں تم سے الگ نہیں ہوں / میں تو خود ان
> ہونٹوں پر ادھوری رہی / جنھیں تم چوم نہ سکے / میں تو خود ان ہاتھوں سے چھوٹ گئی /
> جنھیں تم تھام نہ سکے (۳)

احمد ہمیش کی نظموں میں سیاسی موضوعات پر بھی بات کی گئی ہے۔ نظم "جسم کا نظام" میں وہ جسمانی نظام کو سیاسی نظام کے مشابہ قرار دیتے ہیں۔احمد ہمیش کی اکثر نظموں میں موضوعات کثیر الجہات ہیں۔ نظموں میں شعور کی رو کی تکنیک کا نہایت مہارت کے ساتھ استعمال کیا گیا ہے۔یوں یہ نظمیں بے اختیار ایک موضوع سے چلتی ہوئی دُوسرے موضوع میں داخل ہو جاتی ہیں۔"۱۹۷۳ کی ایک نظم"، "انجلا"، "تمھارے نام بس تمھارے نام"، ان نظموں میں بھی اُنھوں نے اِسی تکنیک (شعور کی رو) کا استعمال کیا ہے۔احمد ہمیش کی نظموں کا خمیر مشرقی تہذیب سے تشکیل پاتا ہے۔وہ اسلامی روایات، آیات اور لفظیات کے ساتھ ساتھ ہندی اور ہند اسلامی تہذیب سے بھی تخلیقی استفادہ کرتے ہیں۔ان کی نظم "رسالت مآب کے حضور میں"، "انجلا۔ قل الروح من امر ربی" میں اس امر کا بہ خوبی اظہار ہوا ہے۔ نظموں کے اقتباس ملاحظہ ہوں:

> میں نے صبر کر لیا تھا کہ صبر کرنے والے اللہ کو / پیارے ہوتے ہیں / تب میں نے
> انگاروں کی زبان سنی کہ / انگارے بھی دہک دہک کر / کوئی ایسی آیت پڑھتے ہیں / جو
> قران پاک کے مرکز میں ہوتی ہے (۴)

احمد ہمیش کی نظموں کے موضوعات میں زندگی اور موت، خوشی اور غم، سچ اور جھوٹ کی کشاکش، ہجرت اور قیام کے دُکھ بیان کیے گئے ہیں۔اکثر تخلیق کاروں کی طرح اُنھیں بھی فن اور تخلیق کی ناقدری کا احساس ستاتا ہے۔وہ کائنات

کے اِس گورکھ دھندے میں کسی پورے سچ یا جھوٹ کو نہیں پا سکے۔ ایک شے کی حقیقت ایک شخص کے لیے دُوسرے سے مختلف ہو جاتی ہے۔ ایک مقام یا مذہب، تہذیب یا کلچر میں کسی چیز کی سچائی دُوسرے میں جا کر مختلف ہو جاتی ہے۔ اسی بات کی طرف اِس نظم میں اشارہ کیا گیا ہے:

کسی بہت بڑے جھوٹ سے ملے ہوئے / کسی بہت بڑے سچ میں / نہ کوئی جھوٹ ملتا ہے
نہ کوئی سچ۔ (۵)

کشور ناہید نے اپنی نثری نظموں میں ایسے نسوانی جذبات و احساسات کو بیان کیا ہے جن پر قلم اُٹھانا معیوب تصور کیا جاتا تھا۔ اُن کی شاعری میں جبر و تشدد پر مبنی رویوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی گئی ہے چناں چہ اُن کی شاعری میں اُن کا عہد بولتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ نظم "نیلام گھر" میں کشور ناہید نے مرد کی حاکمانہ روش کو موضوع بنایا ہے۔ مرد، عورت کو زر خرید غلام تصور کرتا ہے۔ وہ اُس پر ہر طرح کا ظلم و جبر روا رکھنا اپنا حق سمجھتا ہے۔ عورت ہر طرح کا تشدد سہتی ہے کہ یہ معاشرہ مردوں کا ہے اور یہاں کی اخلاقیات بھی مردوں کی بنائی ہوئی ہے۔ یہاں حقوق صرف مرد کو حاصل ہیں۔ عورت کو یہ سکھایا جاتا ہے کہ اُس کا کام شوہر کی غلامی کرنی ہے۔ اُس کی غلامانہ حیثیت کا یہ تقاضا ہے کہ وہ آقا کا ہر حکم بجا لائے، اُس کی گالم گلوچ اور جسمانی تشدد کو سہے اور حرفِ شکایت لب پر نہ لائے۔

موت کا ذائقہ / لفظوں کے پیکر میں / اُس کے ہونٹوں سے ٹپکتا ہے / وہ نفرتوں کو بوسوں کا رنگ دے کر / میرے منھ پر نیلے نیلے داغ ڈال کر / یہ جتانا چاہتا ہے کہ / کہ اُسے میرے جسم کو ہر طرح استعمال کرنے کا حق ہے (۶)

کشور ناہید نے عورتوں کو حوصلے بلند اور عزم توانا رکھنے کا پیغام دیا ہے۔ نظم "روزنامچہ" میں اُنھوں نے جنگِ عظیم دُوم کے حوالے سے بات کی ہے۔ اس جنگ کے بعد مردوں کی تعداد کم ہو گئی تھی۔ اس پر عورتوں نے حوصلہ ہارنے کے بجائے کمرِ ہمت کس لی اور خوش حالی کا مینھ برسا دیا تھا۔ تاریخ کا یہ حوالہ دے کر وہ آج کی عورت کو تحریک و ترغیب دیتی ہیں کہ وہ:

ان ہاتھوں کو بلند رکھو / کہ نیچے آئے / تو بریدہ ہوں گے / ان ہونٹوں کو مصروفِ گفتار
رکھو / کہ خاموش ہوئے / تو سی دِیے جائیں گے / سنو / آگ کو آگ نہیں بجھا سکتی (۷)

ہمارے ہاں مارشل لاؤں کے زمانے میں اخبارات و رسائل پر سنسر لگا دیا جاتا ہے اس حبس زدہ موسم میں جو لوگ مصلحتوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے حق و صداقت کا پرچم سر بلند رکھتے ہیں، وہ قابلِ صد تحسین و تکریم ہیں۔ کشور ناہید نے "تیسرے درجے والوں کی پہلی ضرورت" میں اس طرح کے حق شعاروں اور صدق پرستوں کے وجود

کو غنیمت قرار دِیا ہے۔ ایک عرصے تک ہمارے ملک میں دہشت گردی کا راج رہا۔ معصوم شہری اس دہشت گردی کی نذر ہوتے رہے۔ کشور ناہید نے "خوف کی دستک" انسانیت کے دشمن ان درندوں کا ذکر کیا ہے۔ بچے گولیوں کی آوازیں سننے کے عادی ہو گئے ہیں۔ شاعرہ کا کہنا ہے کہ "انسان" مر گیا ہے۔ انسانیت کا جنازہ نکل گیا ہے۔ کشور ناہید مذہبی جنونیت کی سخت مخالف ہیں۔ مذہب کے وہ اِجارہ دار جنھوں نے قوم کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کے بجائے اِسے فرقوں اور گروہوں میں بانٹ دِیا۔ تھوک کے حساب سے فتویٰ ہائے تکفیر جاری کیے جاتے رہے۔ ایک عرصے تک ملک فرقہ پرستی کی آگ میں جھلستا رہا۔ اس صورتِ حال سے ہر صاحبِ فہم اور حساس دل شخص نالاں رہا۔ نظم "اے میری قوم! اے میری بنتی سن!" میں اُنھوں نے "مولویوں" کو قبول نہ کرنے کی بات کی ہے۔

کشور ناہید ایک باخبر اور حساس شاعرہ ہیں۔ دُنیا میں ہونے والے واقعات کا اُنھیں بہ خوبی اِدراک ہے۔ اُنھوں نے صرف پاکستانی معاشرے میں عورتوں پر ہونے والے مظالم پر آنسو نہیں بہائے، بلکہ اُن کا دِل دُنیا کی ہر مظلوم عورت کے ساتھ دھڑکتا ہے۔ وہ مجبور و مقہور عورتوں کے لیے آواز اُٹھاتی ہیں۔ مثال کے طور پر "یورپ میں نہ پگھلنے والی نظم" میں اُنھوں نے بوسنیا میں ہونے والے مظالم کے خلاف آواز اُٹھائی ہے۔ اسی نظم میں اُنھوں نے روانڈا کی بات کی ہے۔ یہاں ۷/ اپریل سے ۱۵ جولائی ۱۹۹۴ء کے درمیان وسیع پیمانے پر نسل کُشی کی گئی۔ اسی طرح اُنھوں نے صومالیہ میں قحط سالی کے ہاتھوں مرتے انسانوں کا تذکرہ بھی کیا ہے۔۔ اس سلسلے میں اُن کے مجموعہ کلام "آباد خرابہ" میں شامل نظمیں دیکھی جا سکتی ہیں۔ چونتیس اسلامی ممالک کے معاہدے پر کشور ناہید نے "ٹینڈر نوٹس" کے عنوان سے نظم کہی ہے۔

افضال احمد سیّد کی نثری نظموں کا مطالعہ کرنے پر اُن کی نظموں کے جو اہم موضوعات سامنے آتے ہیں، اُن میں تیسری دُنیا کے فلاکت زدہ عوام کا دُکھ اور کرب نمایاں ہے۔ وہ استحصال اور پامال کیے گئے ممالک کے عوام کے مسائل کی ترجمانی کرتے ہیں۔ قدروں کا زوال اور ہمارے بگڑتے ہوئے رویے بھی افضال احمد سیّد کی شاعری کا موضوع بنتے ہیں۔ وسائل کی غیر منصفانہ تقسیم اور اِس کے نتیجے میں اِفلاس کے مارے لوگوں کی مشکلات میں اضافہ بھی اُن کی نظموں میں نمایاں جگہ پاتا ہے۔ انھوں نے بیروت میں قیام کے دوران وہاں حالات کی کشیدگی کے براہِ راست مناظر دیکھے۔ اپنی آنکھوں سے مشرقی پاکستان کو بنگلا دیش بنتے دیکھا، اِس دوران میں وہاں کے لوگوں پر کیا گزری، کس طرح بیرونی قوتوں نے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت پاکستان کو اُس کے ایک بازو سے محروم کیا، افضال احمد سیّد کی شاعری میں اس کی جھلکیاں بھی دیکھی جا سکتی ہیں۔ عصری حسیت افضال کی نظموں میں جابجا دیکھی

جا سکتی ہے۔ ”مٹی کی کان“ افضال احمد سیّد کی ایک نمائندہ نظم ہے۔ یہ ایک طویل نظم ہے۔ اس کے آغاز کا حصہ دیکھیے:

> میں مٹی کی کان کا مزدور ہوں / کام ختم ہو جانے کے بعد ہماری تلاشی لی جاتی ہے / ہمارے نگران ہمارے بند بند الگ کر دیتے ہیں / پھر ہمیں جوڑ دیا جاتا ہے / ہمارے نگران ہمیں لاپروائی سے جوڑتے ہیں / پہلے دِن میرے کسی حصے کی جگہ / کسی اور کا کوئی حصہ جوڑ دِیا گیا تھا / ہوتے ہوتے / ایک ایک رواں / کسی نہ کسی اور کا ہو جاتا ہے / خبر نہیں / میرے مختلف حصوں سے جڑے ہوئے مزدوروں میں کتنے / کان بیٹھنے سے مر گئے ہوں گے / مٹی چرانے کے عوض / زندہ جلا دِیے گئے ہوں گے / مٹی کی کان میں کئی چیزوں پر پابندی ہے / مٹی کی کان میں پانی پر پابندی ہے / پانی مٹی کی حاکمیت کو ختم کر کے اسے اپنے ساتھ بہالے جاتا ہے / اگر نگرانوں کو معلوم ہو جائے / کہ ہم نے مٹی کی کان میں آنے سے پہلے پانی پی لیا تھا / تو ہمیں شکنجے میں اُلٹا لٹکا کر / سارا پانی نچوڑ لیا جاتا ہے / اور پانی کے جتنے قطرے بر آمد ہوتے ہیں / اُتنے دِنوں کی مزدوری کاٹ لی جاتی ہے۔ (۸)

افضال احمد سیّد نے ایک مزدور کے حصے کو دُوسرے کے ساتھ جوڑنے کی بات بھی کی ہے۔ یہ بھی علامتی انداز ہے۔ شاید شاعر کی مراد یہ ہے کہ اس طرح کے عمل سے گزرنے کے بعد کوئی مزدور بھی خود کو سالم اکائی تصور نہیں کرتا۔۔ شاعر یہ کہہ کر معاملے کی سنگینی کو عیاں کرتا ہے کہ اگر مزدور دُشمن عرشی طبقے کے یہ علم میں آ جائے کہ کوئی مزدور پانی پی کر آ گیا ہے تو اُسے شکنجے میں اُلٹا لٹکا کر اس کے جسم میں موجود پانی کا ایک ایک قطرہ نچوڑ لیا جاتا ہے۔ ہر قطرے کے بدلے اُس کے ایک دِن کی مزدوری کاٹ لی جاتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی کے دل میں انقلابی افکار پیدا ہونے بھی لگیں تو مقتدر طبقہ اُسے اذیتیں دے کر اُس کو ابدی نیند سلا دیتا ہے۔ اس نظم کے بارے میں طارق ہاشمی کا کہنا ہے کہ ”تجریدی افسانے کے پیرائے میں لکھی گئی اِس نظم میں شاعر نے کئی ایک کردار دِکھائے ہیں، جو مختلف اِنسانی رویوں کی علامتیں ہیں۔" (۹)

"چھینی ہوئی تاریخ“ کا شمار بھی افضال احمد سیّد کی نمائندہ نظموں میں ہوتا ہے۔ یہ ایک طویل نظم کا آغاز ہے۔ غور کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ افضال احمد سیّد کی اِس نظم کا پس منظر ستمبر گیارہ کے بعد اُسامہ بن لادن اور اُن کے ساتھیوں کے خلاف افغانستان میں ہونے والا اتحادی افواج کا اپریشن ہے۔۔ عورتوں پر ہونے والے مظالم بھی افضال احمد سیّد کی شاعری کا موضوع بنتے ہیں۔

کراچی، جو کبھی روشنیوں کا شہر ہوا کرتا تھا، نہ جانے اسے کس کی نظر کھا گئی۔ کئی دہائیوں تک اس شہر میں فسادات کی آگ بھڑکتی رہی۔ افضال احمد سیّد نے یہ خونیں مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ ''روکوکو اور دُوسری دُنیائیں'' میں شامل نظم ''ہمیں بہت سارے پھول چاہییں'' اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ کراچی کے ابتر حالات کی وجہ سے قانون نافذ کرنے والے اِدارے اس شہر میں گشت کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ افضال احمد سیّد کی شاعری میں رینجرز کی موبائیلوں، بکتر بند گاڑیوں اور ٹینکوں کا حوالہ ملتا ہے۔ ''ایک آئس کریم کو متعارف کرانے کی مہم'' اس کی ایک مثال ہے۔ قدروں کی پامالی آج کے دور کا ایک بہت بڑا المیہ ہے۔۔ افضال احمد سیّد ہر ذی شعور، حساس اور صاحب دل انسان کی طرح اِس صورتِ حال سے پریشاں اور نالاں ہیں۔ انسانی بے حسی کا المیہ اُنھیں یہ کہنے پر مجبور کرتا ہے کہ:

ہمیں کچھ لفظوں کو بالکل بھول جانا چاہیے / مثلاً / بنی نوعِ انسان (۱۰)

عذرا عباس معاشرے میں پائے جانے والے ہر طرح کے ظلم و جبر کے خلاف ہیں۔ یہ ظلم و جبر صرف عورتوں تک ہی محدود نہیں۔ تمام بنی نوع انسانی کے حوالے سے اس میں ہمدردی کا اظہار ملتا ہے لیکن ہمارا معاشرہ مرد کا معاشرہ ہے۔ یہاں مرد کو ہر مقام پر غالب حیثیت حاصل ہے۔ عذرا عباس کی نظمیں عورت کی بے بسی اور مرد کی بے حسی کا نوحہ ہیں۔ وہ اپنی نظموں میں ظلم و جبر کی چکی میں پستی زخم زخم عورت کی بے چارگی، محکومیت اور مظلومیت کی داستانیں بیان کرتی ہے۔ وہ عورت کو اِس لاچاری سے نکال کر بااختیار حیثیت میں دیکھنا چاہتی ہیں۔۔ اپنی نظم ''ایک روٹی تک پہنچنے کے لیے'' عذرا عباس نے اسی صورتِ حال کی عکاسی کی ہے:

ایک روٹی تک پہنچنے کے لیے / ہم اپنے خواب بیچ دیتے ہیں / اپنے رنگ دھو ڈالتے ہیں / اپنی خوشبو اُڑا دیتے ہیں / اپنی آنکھیں دُھندلی کر لیتے ہیں / اور اپنے جسموں کو صد ہا سال سے / چلتی ہوئی چکی میں / پیس ڈالتے ہیں / اور کیا کرتے ہیں؟ / اور کیا نہیں کرتے! / ہمیں کوئی بھی اختیار نہیں / بس ایک روٹی تک / پہنچنے کے لیے (۱۱)

موجودہ دَور کے سماجی مسائل میں سے ایک مسئلہ انسان کی تنہائی بھی ہے۔ بھرے پرے شہروں میں رہتے ہوئے بھی انسان خود کو تنہا محسوس کرتا ہے۔ گو تیز ترین ذرائع مواصلات کی بدولت فاصلے سکڑ گئے ہیں، لیکن رُوحانی بُعد ہے کہ بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ اس مشینی دور کی ایک دین یہ بھی ہے کہ انسان بہ ظاہر دوسرے انسان کے پاس ہوتے ہوئے بھی خود کو کوسوں دُور محسوس کرتا ہے۔ عذرا عباس اپنی نظم ''یہ صدی'' کے شروع میں فاصلوں کو تانیثی پیرائے میں بیان کرتی ہے:

یہ صدی فاصلوں کی صدی ہے / اس کا درد / بچہ پیدا کرنے والی عورت کے / دردوں سے بڑھ کر ہے (۱۲)

سارا شگفتہ کی شاعری دراصل اُس کی ذات کے اَسرار اور محرومیوں کی کہانی معلوم ہوتی ہے۔ اِس کے ساتھ ساتھ مرد اَساس سماج میں عورت کا ہر طرح کا استحصال بھی اِن نظموں میں جابجا نظر آتا ہے۔ لڑکی کی پیدائش ہی اُس کی خطا بن جاتی ہے۔ دُنیا میں اُس کا اِستقبال نہایت بے دِلی اور دُکھ کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ بیٹے کی طرح اُس کی پیدائش کا جشن منایا جاتا ہے نہ اُس کی صحت اور دیگر ضروریات ومعاملات کی نگرانی کوئی کرتا ہے۔ ہمیشہ وہ کسی نہ کسی کی ملکیت رہتی ہے۔ بیٹی ہو تو باپ کی ملکیت؛ شادی ہونے کی صورت میں خاوند کی ملکیت اور صاحب اولاد ہونے کی صورت میں بیٹے کی ملکیت بن جاتی ہے۔ اُس کا تشخص، سوچ اور اِختیار نہ ہونے کی وجہ سے ایک ہمیشہ کی تنہائی اُس کا مقدر رہتی ہے۔ سارا شگفتہ نے اِن تلخ حقائق اور جذبات کا اظہار "اے میرے سر سبز خدا" میں خدا سے شکوہ کرتے ہوئے کیا ہے:

> بین کرنے والوں نے / مجھے ادھ کھلے ہاتھ سے قبول کیا / انسان کے دو جنم ہیں / پھر شام کا مقصد کیا ہے / میں اپنی نگرانی میں رہی اور کم ہوتی چلی گئی / کتوں نے جب چاند دیکھا / اپنی پوشاک بھول گئے / میں ثابت قدم ہی ٹوٹی تھی / اب تیرے بوجھ سے دھنس رہی ہوں / تنہائی مجھے شکار کر رہی ہے (۱۳)

سارا کی نظموں میں بہت کاٹ دار انداز میں اِس معاشرے پر طنز کیا ہے۔ ہماری سوسائٹی میں مرد اور اور عورت کے لیے عزت کے معیارات مختلف ہیں نظم "عورت اور نمک" پڑھتے ہوئے قاری کو بڑی شدّت سے اِس بات کا احساس ہوتا ہے۔ سارا شگفتہ کے ہاں بعض موضوعات کی تکرار ہے۔ سارا شگفتہ جس عہد میں لکھ رہی تھیں، اُس عہد میں عورت کا یوں بے باکی سے مرد کے سامنے آکر اپنے جذبات کا اظہار کرنا ایک مشکل امر تھا۔

نصیر احمد ناصر کی شاعری کے موضوعات زندگی، موت، تنہائی اور جدید دور کی ٹیکنالوجی کے سبب ہونے والی تبدیلیاں، دیہاتوں سے شہروں کی طرف ہجرت، سائبر ایج کے مسائل، کتاب کلچر کا خاتمہ، امت مسلمہ کے ساتھ ہونے والے ظلم وستم، دُنیا کے اندر ہونے والا انتشار، جنگ و جدل، محبت کے حوالے سے شاعر کا فلسفہ اور خوابوں کی شکست وریخت ہیں۔ نصیر احمد ناصر تخلیقی عمل کو ایک ایسا عمل مانتے ہیں جو زمین اور زندگی کو موضوع بناتا ہے۔ تخلیق کار وقت زمانے اور زمین آسمان سب کو اپنے دل میں بسا کے رکھتا ہے۔ ایک کڑی تپسیا کے بعد جو ایک تخلیق کی شکل میں سامنے آتا ہے۔ نظم "شجر آباد" میں اسی حقیقت کو پیش کیا گیا ہے۔ انسان نے آج تک جو ترقی کی ہے وہ سب ان خوابوں کے ہی بدولت ہے جو کسی نہ کسی انسان نے دیکھیں۔ نظم "خواب اور محبت کی کوئی عمر نہیں ہوتی" میں نصیر احمد ناصر نے یہی بیان کیا ہے۔ نصیر احمد ناصر اپنے عہد کے مسائل سے بے خبر نہیں ہیں۔ وہ دیکھتے

ہیں کہ کس طرح جدید دور کا انسان تنہائی سے دو چار ہے۔یہ تنہائی بعض اوقات موت کی خواہش کا سامان بن جاتی ہے۔انسان ناسٹلجیا کا شکار ہو کر گذرے ہوئے زمانے اور واقعات کو دوہراتا رہتا ہے۔

> زندگی مرگ مسلسل سے دو چار ہو / تو موت ایک گھسا پٹا لفظ بن کر رہ جاتی ہے / متروک دنوں کی آبیاری سے / بے دلی کی مشقت کے سوا کچھ نہیں اُگتا / اس سے پہلے کہ ہم حالت تنہائی میں / کسی نادیدہ ستارے سے دیکھ لیے جائیں / آؤ ان کہنہ عمارتوں کے صدر دروازے سے گزریں (۱۴)

جدید عہد اپنے ساتھ جہاں نت نئی دریافتیں اور ٹیکنالوجی لے کر آیا ہے وہیں فطرت کے ساتھ اس کا تعلق کم ہو گیا ہے۔ کھیل کے میدان کھیلنے والوں سے خالی ملتے ہیں۔ آبائی گھر اور گاؤں شہر جا کر بسنے والے مکینوں کا راہ تکتے رہتے ہیں۔املی اور املتاس کے درخت۔چونا گچ نم خوردہ دیواریں، بے تحاشا بڑھی ہوئی بیلیں، چھتوں پر اگی لمبی گھس، ایک سوگواریت کے عالم میں منتظر رہتے ہیں۔۔ نظم "آبائی گھروں کے دکھ" میں اسی بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے:

> آبائی گھروں کے اندر چیزیں بھی ایک سی ہوتی ہیں / پڑچھتیوں پر تانبے اور پیتل کے برتن / گرد جھاڑنے اور قلعی کرنے والے ہاتھوں کا انتظار کرتے ہیں / چنیوٹ کا فرنیچر / اور گجرات کی پیالیاں چینکیں / کالی پڑی رہتی ہیں / کھونٹیوں پر لٹکے ہوئے کپڑے اور برساتیاں / اترنے کے منتظر رہتی ہیں / اور چہل قدمی کی چھڑیاں اور کھونڈیاں / سہارا لینے والے ہاتھوں کو ڈھونڈتی ہیں فریم کیے ہوئے شجرے / بلیک اینڈ وائٹ اور سیپیا تصویریں / اور طاقوں میں رکھی ہوئی مقدس کتابیں / اور کامریڈی دور کا مارکسی ادب / سب کچھ اپنی جگہ پر پڑا ہوتا ہے (۱۵)

علی محمد فرشی کی نثری نظم فکری سطح پر ایک وسیع کینوس رکھتی ہے۔اس میں ہمارے سیاسی، سماجی، معاشی، معاشرتی اور تاریخی حالات و واقعات پوری شعریت کے ساتھ اپنی چھب دکھلاتے ہیں۔ان کی نثری نظموں میں کمال اختصار اور جامعیت کے ساتھ بڑی سے بڑی بات انوکھے انداز میں پیش کی گئی ہے۔ نظم "ذرا سی دیر میں" اس کی ایک مثال ہے:

> ذرا سی دیر میں / میری بیٹی کا جیومیٹری باکس / جیولری باکس میں تبدیل ہو گیا / میرا بیٹا کوہ قاف سے پری اڑا لایا / میری بیوی کی دعائیں خدا کو چھونے لگیں / اور میں اس عرصے میں / ایک کتبہ ہی تصنیف کر سکا (۱۶)

علی محمد فرشی کی نثری نظمیں تنہائی اور اُداسی کی کیفیات کا مرقع ہیں۔ صنعتی اور سرمایہ دارانہ تہذیب، جس نے انسان کو مادہ پرست اور ایک دوسرے کے لیے اجنبی اور اکیلا کر دیا ہے، اس تنہائی کی کیفیت اور اُداسی میں خود

سے مکالمہ کرتا ہے۔ خود کلامی کی ایسی کیفیات علی محمد فرشی کی نظموں میں بھی جا بجا نظر آتی ہیں۔ یہ کیفیات کبھی تو درجِ بالا تنہائی کا شاخسانہ دکھائی دیتی ہیں اور کبھی خود آگہی یا خود شناسی کی طرف جانے والا ایک راستہ۔ نظم ''اندھی معیشہ'' میں یہی تنہائی اور خود کلامی کی کیفیت نظر آتی ہے۔

علی محمد فرشی کی نثری نظموں میں کہانی پن، اساطیر اور روایت کا پوری فہم کے ساتھ استعمال ملتا ہے۔ اس سے ان کی شاعری میں شعریت اور تجریدیت کا ایک اعتدال ملتا ہے۔ بعض اوقات جذبات، کیفیات اور احساسات کو کردار بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ ''احساسات کی تجسیم''، ''گم شدہ شہر میں''، ''آٹھواں اعتراف''، ''چڑیا کے فاقہ زدہ گیت''، ''تاریخ کی مکھی''، ''عیب دار خوشی''، ''شاعری کا گھونسلا'، ''میں زمین کا لباس تہ کر سکتا ہوں'' اور بہت سی دیگر نظموں میں بھی موجود ہے۔

علی محمد فرشی کی شاعری ملکی اور بین الاقوامی سیاسی صورت حال کو پیش کرتی ہے۔ پاکستان اور اس جیسے دوسرے ترقی پذیر ممالک جو عالمی طاقتوں کے ہاتھوں میں کھلونا بن چکے ہیں۔ ان کا سیاسی معاشی اور سماجی نظام جس تنزل اور بحران کا شکار ہے، خصوصاً پاکستان میں ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر حملے کے بعد افغانستان اور عراق پر امریکی قبضے سے لے کر اب تک کی اس ناہموار سیاسی صورتِ حال کا اثر پوری دُنیا کو کسی نہ کسی طرح متاثر کرنے کا سبب بنا۔ اسی تناظر میں ایٹمی جنگ کے مضمرات کے حوالے سے ان کی نظم ''کینچوے کے بل میں'' کی مثال پیش کی جاسکتی ہے۔ علی محمد فرشی کی شاعری میں گلوبلائزیشن کے نتیجے میں آنے والی تبدیلیوں کا ذکر بار بار ملتا ہے۔

تنویر انجم کی شاعری میں خوابوں کا بہ کثرت ذکر ملتا ہے۔ شاعرہ کو خواب بہت عزیز ہیں۔ لفظِ خواب اُن کی اکثر و بیش تر نظموں میں ملتا ہے۔ اُن کی نظم ''جنم کے جال'' میں خوابوں کا ذکر ہے۔ ان کی شاعری آرزوؤں اور خواہشات کی شاعری ہے۔ نظم ''پیاس کا گیت'' میں وہ اپنی محرومیوں کا ذکر کرتی ہیں۔ وہ چاہتی ہیں کہ زندگی اُن پر اپنی نوازشات کی بارش کر دے۔ شاعرہ کی رُوح جھلس رہی ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ اُس کی جلتی، جھلستی رُوح شاداب ہو جائے۔

زندگی کے درختو! / تم نے کبھی میری رُوح پر اپنا سایہ نہیں کیا / زندگی کے دریاؤ! / تم نے کبھی میرے اندر کو نہیں بھگویا! / آؤ! / میری رُوح کو دُھوپ میں کندن بننے والے لفظ دیکھو! / آؤ!! / میری پیاس کے گیت سنو! / اور اِس سے پہلے کہ شادابیاں ختم ہو جائیں! / زندگی کے درختو! / کسی ایک لفظ کو ہی اپنے پھولوں کے آسمان میں

ٹانک دو! / اور میری مٹھی کے اطراف سے نکل جانے والی خوش بوؤں کو بتاؤ! / میرے ہاتھوں نے کتنی آتماؤں کو جگنو بنادیا ہے![۱۷]

"نئے نام کی محبت" کی نظموں میں شاعرہ کی تنہائی اور اُداسی کا بار بار تذکرہ ملتا ہے۔ لگتا ہے کہ باوجود جسمانی قرب کے کوئی رُوحانی بُعد ہے جو شاعرہ کو اندر ہی اندر کھائے جارہا ہے۔ باوجود مادّی آسائشوں کے اُس کی رُوح بے چین اور بے قرار ہے۔ وہ سکون کی طالب ہے۔ ماضی کی سہانی اور دِل فریب یادیں اُس کی زندگی کا قیمتی اثاثہ ہیں۔ وہ انھی حسین اور خوش گوار یادوں کے سہارے زندگی گزارنا چاہتی ہے۔ "ماضی کے باغ میں پھول" میں وہ ایک ایسی ہی دُنیا بسانا چاہتی ہے جس سے اُس کی پریشان حالی اور تنہائی کا ازالہ ہو سکے۔ تنویر انجم محبت اور پیار کی دُنیا بسانے کی آرزو مند ہیں۔ ایسی دُنیا جہاں کوئی طبقاتی اُونچ نیچ نہ ہو، ایسی دُنیا جہاں امیر و غریب کی کوئی تفریق یا تمیز نہ ہو؛ ایسی دُنیا جہاں سب ایک ہی سطح پر زندگی گزار رہے ہوں؛ ایک ایسی دُنیا جہاں نفرتوں، عداوتوں، کدورتوں اور تعصبات کا کوئی گزر نہ ہو؛ ایک دُنیا جہاں ہر طرف محبتوں کی فراوانی ہو؛ ایک دُنیا جہاں بھائی چارے کی فضا ہو؛ ایک ایسی دُنیا جہاں سب مل جل کر رہتے ہوں۔

تنویر انجم نے کام کرنے والی عورتوں کے مسائل کو بھی اپنی شاعری کا حصہ بنایا۔ مثال کے طور پر "میری اور تمھاری غربت کی داستانیں" کے دو کردار ــــــ ایک وہ عورت جو دُوسروں کے گھروں میں کام کاج کر کے اپنے بچوں کا پیٹ پال رہی ہے اور دُوسرا کردار شاعرہ خود ــــــ اپنے اپنے مسائل کا شکار ہیں۔ اس میں شاعرہ نے گھر میں کام کرنے والی عورت کی ہر روز سنائی جانے والی کہانی بیان کی ہے۔ نظم کا انجام ایک ایسے موڑ پر ہوتا ہے جہاں کام کرنے والی عورت کی مجبوری کی طرح شاعرہ کی مجبوری کا بھی اظہار ہوتا ہے۔ "ہوائیں سرد ہیں" میں عصری حسیت کی جھلکیاں بھی دیکھی جا سکتی ہیں۔ کھلونا بموں کی نذر ہونے والے معصوم بچوں کے ساتھ ساتھ زچگی کے مراحل سے گزرتی عورت کے درد کا قصہ اور کسی جنگی محاذ پر جاتے ہوئے سپاہی کی ماں کا دُکھ بھی بیان کر دیتی ہیں۔

ذی شان ساحل پاکستانی نثری نظم کے اہم شاعر ہیں۔ ذی شان ساحل جدید اُردو نظم کے ایک ایسے شاعر ہیں جو اپنے عہد کے مسائل اور احساسات سے اچھی طرح باخبر ہیں۔ وہ بنی نوعِ انسان کو دُوسروں کے لیے خیر اور بھلائی کا سبب دیکھنا چاہتے ہیں۔ اُن کی کئی نظمیں اِسی بات کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ انسان کہیں بھی ہو، کسی بھی حالت میں ہو، اُسے دُوسروں کی تکلیف اور دُکھ کو محسوس کرنا چاہیے۔ ممکن ہو تو اِس تکلیف کو دُور کرنے کے لیے سعی

بھی کرنی چاہیے۔ اُن کا نظریہ ہے کہ بدی کا جواب بدی سے نہ دیا جائے۔ دُوسروں سے برے سلوک کے باوجود انسان کو نیکی کا برتاؤ کرنا چاہیے:

> اگر آپ ایک / درخت ہیں / تو ظاہر ہے / آپ کو بننا چاہیے / ایک سایہ دار درخت /
> اور اگر آپ کے پتے / کسی خزاں میں گر جائیں / تو آپ کی کوشش ہونی چاہیے / کہ
> بہار کا پہلا پھول / یا بارش کے بعد کھلنے والی پہلی کونپل / آپ ہی کے حصے میں آئے /
> اگر آپ ایک درخت ہوں / اور کوئی آپ کو کاٹ ڈالے / تو افسوس مت کیجیے / ہو سکتا
> ہے آپ کا تعلق / درختوں کے اُس خاندان سے ہو / جس میں ہزاروں برس پہلے /
> کسی نبی نے پناہ لی تھی / اپنے کاٹ کے لے جائے جانے پر افسوس مت کیجیے گا / ہو سکتا
> ہے / آپ سے ایک ایسی کرسی بنائی جائے / جس پر بیٹھ کر کوئی لڑکی اپنے محبوب کو /
> ہمیشہ یاد کرتی رہے۔ (۱۸)

ذی شان ساحل کی شاعری فطرت کے حسن اور محبت کے رنگوں سے بنائی ہوئی خوب صورت لفظی تصویروں کا مرقع ہے۔ وہ کسی پرانی آٹو گراف بک میں مرجھایا ہوا پھول دیکھ کر یا کسی قبر کے سرہانے پھول دیکھ کر بھی خوشی کا اظہار کرتے ہیں۔ ان کی نظم ''پھولوں کے لیے نظم'' میں اِسی طرح کے جذبات کا اظہار ہے۔ ذی شان ساحل کی نظموں کے کئی عنوانات بھی فطرت سے اُن کی گہری محبت اور لگاوٹ کی نشان دہی کرتے ہیں۔ مثلاً تتلی کا کمرہ، کہر آلود آسمان کے ستارے، یہ آسمان ہے، چڑیوں کا شور، میر اخرگوش، کبوتر وغیرہ۔ ذی شان ساحل اپنے عہد کے اِنتشار اور افراتفری سے تلخی کے بجائے شیریں نظمیں تخلیق کرتے ہیں۔ وہ محبت کرنے والوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اُن کی یاد میں نظمیں لکھتے ہیں۔ اُنھیں خوشی کی موت گوارا نہیں۔ زندہ رہنے کے لیے اُنھیں اُس ایرینا کی تلاش ہے جہاں وہ سانس بھر ہوا لے سکیں۔ ذی شان ساحل ملکی اور بین الاقوامی سیاست، سماجیات اور ادب پر گہری نگاہ رکھتے ہیں۔ وہ وسیع المطالعہ شخص تھے۔ اس کا اندازہ ان کی نظموں کے موضوعات سے بھی ہوتا ہے۔ ان کی بہت سی نظمیں بین الاقوامی شہرت یافتہ ادیبوں اور شاعروں کے حوالے سے لکھی گئی ہیں۔ مثلاً، ''تادیوے روزے وچ کے لیے''، ''گستاپو''، ''محمود درویش کے لیے خط''، ''نیشنل پارک''، ''گھومتے ہوئے گلوب پر''، ''آندرے''، ''اکیڈمی میرا بائی''، ''انڈیا''، ''پریسلر ترمیم''، ''گوربا چوف ۱۹۹۱''، ''کرسٹوفر کی مصروفیات''، ''مارکو پولو اینڈ کو''، ''ای میل''، ''جہاز'' وغیرہ۔ وہ خود کو بین الاقوامی شہری تصور کرتے ہیں۔ مشرق سے زیادہ اُنھیں مغرب کا کلچر اور لوگ زیادہ پسند ہیں ذی شان ساحل کی شاعری میں بھی وہی مسائل موجود ہیں جو جدید عہد کے فرد کے مسائل ہیں یعنی فرد کی تنہائی اور تشخص کے مسائل۔ ذیشان ساحل کی انفرادیت یہ ہے کہ اُس نے اِن

مسائل کا حل بھی اپنی نظموں میں پیش کیا ہے۔ اگر ذی شان ساحل کی نظموں میں صرف کسی ایک بات کی نشان دہی کرنی ہو تو وہ ہو گی محبت اور زندگی کو مثبت انداز میں دیکھنے کا جذبہ۔

(ب) بھارتی نثری نظم کا فکری اور موضوعاتی مطالعہ

پروفیسر خورشید الاسلام نے جن موضوعات پر نظمیں کہی ہیں، اُن میں عورت اور اُس کے حوالے سے جنسیات، مناظرِ فطرت، مومن، تصوف اور مقولے قابلِ ذکر ہیں۔ خورشید الاسلام نے بعض نظموں میں اپنے فلسفیانہ اور صوفیانہ تصورات بھی بیان کیے ہیں۔ مثال کے طور پر اس چار سطری نظم کو ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔

کسی پتی میں بھی صرف اپنی / خوشبو نہیں ہوتی / ہر پتی میں سارے پھول کی / خوشبو ہوتی ہے (۱۹)

انسان کی فطرت سے دُوری آج کے انسان کا ایک بہت بڑا المیہ ہے۔ بڑے شہروں میں رہنے والوں کے ہاں اس المیے کی شدت بھی زیادہ ہے۔ انسان مادّہ پرستی کے دلدل میں پھنس چکا ہے۔ فطرت اور اس کے دل کش عناصر سے لطف اُٹھانے کے لیے اُس کے پاس وقت ہی کب ہے! چاند کب نکلا اور کب ڈوبا، اسے کیا علم۔ چودھویں رات کو چاند پر جو شباب آتا ہے، اسے اس کا کیا علم! وہ ایک ایسی دُنیا کا باشندہ بن کر رہ گیا ہے جس میں فطرت اور اس کے حسنِ بے پایاں کی بے وقعتی اور بے توقیری کا راج ہے۔ دو سطروں پر مشتمل اس مختصر نظم میں انسان کی فطرت سے اسی لاتعلقی کو موضوع بنایا گیا ہے۔

بڑے شہروں میں آسمان / دکھائی نہیں دیتا (۲۰)

خورشید الاسلام کی شاعری میں بھی وہی ازلی اور ابدی سوالات نظر آتے ہیں۔ جو انسان اور خدا سے متعلق ہیں۔ ہماری تاریخ ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہے کہ غیرت مند اور قوم و وطن کے مخلص لوگوں کڑی سزائیں دی گئیں۔ جب کہ سازشی اور میر جعفر و صادق لوگ عیش دوام پاتے رہے۔ سیاسی اور سماجی وڈیرے اپنی اجارہ داری کے لئے ہر دور میں منافقوں کو نوازتے ہیں اور سچے اور کھرے لوگوں سے دوری اختیار کرتے ہیں۔ اس تلخ حقیقت کا اظہار خورشید الاسلام نے اس نظم میں کیا ہے۔

یہاں نامردوں / کے جنازے پر زبردست / ماتم ہوتا ہے / اور مردوں / کو چپکے سے /
زمیں میں / گاڑ دیتے ہیں (۲۱)

ڈاکٹر محمد حسن کی نظموں کے موضوعات میں انسانی استحصال کا موضوع بہت اہم اور نمایاں ہے۔ معاشرے میں ہونے والے جبر واستبداد اور مظالم کا احوال بھی ان نظموں میں ملتا ہےحق و صداقت کے راستے پر چلنے والے کو بے تحاشا قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔ نظم۔ ''شکنجے'' میں ایک ایسے ہی انقلابی کی تصویر کھینچی گئی ہے۔ اس کی بچیاں، بوڑھی ماں، بہنیں، دُنیا کی رونقیں اور رغبتیں، کھیل تماشے، محبوب، سماجی تقریبات یہ سب پنجرے اور آہنی شکنجے ہیں۔ ان سب مجبوریوں کے شکنجوں کو توڑتے ہوئے حق پرست اور اِنقلاب کے خوگر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ اِس نظم کے فٹ نوٹ میں خود شاعر نے لکھا ہے کہ ''زندگی کی چھوٹی مسرتیں اور ذِمہ داریاں انقلابی کو مجاہدانہ راستے سے روکتی ہیں ہر دور میں استحصالی طاقتوں نے لاچار لوگوں کو اپنے استبدادی پنجے میں دبا کے رکھنے کی کوشش کی ہے۔ اِن حالات میں بھی بعض سر پھرے، باغی، سرکش اور انقلابی اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ وہ اِن طاغوتی قوتوں کو للکارتے ہیں۔ فتح یا شکست سے بے نیاز، جراتوں اور صداقتوں کے یہ پیام بر جبر کی سنگلاخ چٹانوں سے ٹکرا جاتے ہیں۔ انھیں انجام کی پروا نہیں ہوتی۔ نظم ''ویران غار'' میں ایسے ہی سر فروشوں کی داستانِ حریت بیان کی گئی ہے۔

دُنیا میں مجبور اِنسانوں کے لیے زندگی گزارنا بہت مشکل ہے۔ ان مفلوک الحال لوگوں کے لیے زندگی کسی اذیت سے کم نہیں۔ ان کے لیے ضروریاتِ زندگی پوری کرنا مشکل ہوتا ہے۔ وسائل سے محروم یہ بے چارے مسائل کی دلدل میں دھنستے چلے جاتے ہیں۔ اس نظم کا استعاراتی نظام بہ طورِ خاص قابلِ ذکر ہے۔ زمیں، کیڑے، دلدل، ستارے، آسماں سبھی استعارے ہیں۔ مسائل کے انبار اور ناموافق حالات کے باوصف شاعر کا رِجائی انداز بھی خوب ہے۔ آسمان پر دُور چمکنے والے دو ستارے کسی انقلاب کا مژدۂ جاں بخش سناتے دِکھائی دیتے ہیں۔

یہ زمیں کہتی ہے / چاروں اور دلدل ہے / یہاں کیڑے ہیں تیرا جسم / تیرا ہر رگ وریشہ / ان کا مقدر ہے / یہ تیرے جسم کو کھائیں گے / تیری ہڈیاں چاٹیں گے / اور تیرے لہو سے پیاس بجھائیں گے / اور اِن سے بچ نکلنا غیر ممکن ہے / یہ دلدل ہی مقدر ہے کہ نیچے اور نیچے دھنستے رہنا ہے / مگر وہ دو ستارے آسماں پر دُور سے جو مسکراتے ہیں / بلاتے ہیں! [۲۲]

ڈاکٹر محمد حسن کے ہاں استحصال زدہ طبقے کی نامرادیوں اور محرومیوں کو زبان دی گئی ہے۔ اِاُن کی نظم ''اعداد و شمار'' میں انسانی کرب چیخ چیخ کر قاری کو انسانوں پر مسلط کی جانے والی درندگی، بربریت اور وحشت کی داستان سنا رہا ہے۔ یہ نظم سری نگر کے مقام پر ۳ جولائی ۱۹۷۲ء کو لکھی گئی تھی۔۔ ڈاکٹر محمد حسن کی مذکورہ نظم کی تفہیم کے لیے شملہ معاہدے کا ذہن میں ہونا ضروری ہے۔

باقر مہدی کی شاعری کے موضوعات کو اگر دو لفظوں میں بیان کرنا ہو تو وہ دو لفظ ہیں: انقلاب اور بغاوت۔ باقر مہدی مروجہ سیاسی و معاشی نظام سے ناخوش ہیں۔ اس نظام نے انسان کو غربت و اِفلاس کے سوا دِیا ہی کیا ہے۔ دُنیا میں جہاں بھی کسی مجبور اور بے بس پر ظلم ہوتا ہے، باقر مہدی اس پر صدائے احتجاج بلند کرتے نظر آتے ہیں۔ مثال کے طور پر ویت نام میں امریکی افواج نے وحشت و بربریت کی جو داستان رقم کی، اُسے کون بھول سکتا ہے۔ اگرچہ اس جنگ میں اٹھاون ہزار امریکی بھی کام آئے لیکن ویت نام کے بیس لاکھ شہری اس جنگ کی نذر ہوئے۔ کوئی ترپن لاکھ ویت نامی زخمی ہوئے جب کہ ایک کروڑ سے زیادہ شہری اپنے ہی وطن میں پناہ گزین ہو گئے۔ امریکی مظالم کا اندازہ اِس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ مارچ ۱۹۶۸ء میں ہونے والے قتلِ عام میں چار گھنٹوں میں پانچ سو ویت نامی موت کے گھاٹ اُتار دِیے گئے۔

باقر مہدی نے امریکی افواج کی طرف سے ڈھائے جانے والے مظالم پر شدید غم و غصے کا اِظہار کیا ہے۔ اُنھوں نے قیامِ امن کے سلسلے میں اقوامِ متحدہ کی بے بسی کا بھی ذکر کیا ہے۔ نظم "ویت نام" کی ابتدائی سطور ملاحظہ کیجیے:

> ہرے بھرے، گھنے گھنے جنگل پر، ننھی ننھی کلیوں جیسے گاؤں / کھلتے ہنستے شہروں پر /
> آتش بازی کرتے ہیں / یو۔ این۔ او، اِک بیوہ ہے سارا تماشا خاموشی سے دیکھ رہی ہے
> / دُنیا بھر کے سارے مدبر، نیلے کاغذ لیے ہوئے سرگوشی کرتے پھرتے ہیں / من کی
> مریم جھاڑی جھاڑی چھپتی پھرتی ہے (۲۳)

سماج میں موجود بورژوازی (سرمایہ دار طبقہ) اشرافیہ گردانا جاتا ہے۔ اپنی دولت کے بل بوتے پر یہ طبقہ پرولتاریہ (مزدور طبقہ) کا اِستحصال کرتا ہے۔ اسی لیے بورژوازی طبقے کو استحصالی طبقے کا نام بھی دِیا جاتا ہے۔۔ یہ طبقہ اہلِ قلم کی خرید و فروخت کا گھناؤنا کاروبار بھی کرتا ہے۔ اپنے حق میں لکھوانے کے لیے یہ طبقہ ادیبوں اور شاعروں کی بولی لگاتا ہے۔۔ نظم "سیاہ / سیاہ" میں اسی حقیقت کا اظہا ملتا ہے۔ "سیاہ سیاہ" میں "ایک کالی نثری نظم" میں عظمتِ رفتہ کے مٹ جانے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ہم اپنے اَسلاف سے زندگی کی آخری سانس تک منسلک رہتے ہیں۔ بغاوت کا عَلم، خواہ کتنا ہی بلند کیوں نہ ہو، اُسے سرنگوں ہونا پڑتا ہے۔ ہماری نئی نسلیں اپنے رویوں پر متاسف ہوتی ہیں، مگر اُس وقت جب عظمتوں کے نشان مٹنے لگتے ہیں۔ نئی اَقدار کو دانش مندی، میانہ روی اور سبک خرامی سے بروئے کار لایا جائے تو رفعتوں کے تمام اسباق یاد رہتے ہیں۔

زاہدہ زیدی کے مجموعۂ کلام ''شعلۂ جاں'' کے آخر میں چھ نثری نظمیں ہیں۔ پہلی نظم کا عنوان ہے ''خزاں رسیدہ''۔اِس نظم کا خیال بہت حد تک اقبال کی نظم ''پیوستہ رہ شجر سے اُمیدِ بہار رکھ'' کے موضوع سے ملتا جلتا ہے۔ سولہ سطروں پر مشتمل اس نثری نظم میں شاعرہ نے یہی بات سمجھائی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اقبال نے شاخِ بریدہ کی بات کی ہے جب کہ زاہدہ زیدی نے ڈالی سے ٹوٹنے والے پتے کا ذکر کیا ہے۔ ایک اور نظم بعنوان ''سچائی'' میں یہ حقیقت بتائی ہے کہ سچائی کو چھپانے کی لاکھ کوشش کی جائے، وہ بالآخر سامنے آکر ہی رہتی ہے۔ بہت آسان لفظوں میں شاعرہ نے اپنا اخلاقی پیغام قارئین تک پہنچایا ہے کہ سچائی کو چھپانا یا دبانا مناسب نہیں۔ ذاتی اور کائناتی جلوہ نمائی نیز وجدانی وماورائی احساس کی نور افشانی کے لیے یہ نثری نظم ملاحظہ کی جاسکتی ہے:

جب رات کو۔۔۔ / تارے۔۔۔ آسماں پر / گنگناتے ہیں۔۔۔۔ / تو
میرے۔۔۔۔ / دِل کے تاروں میں بھی / ارتعاش پیدا ہوتا ہے / لیکن میرا دِل /
تاروں کی محفل تو نہیں / اس لیے۔۔۔ / وہ نغمہ۔۔۔ / خاموشی کے ساگر میں /
۔۔۔ڈوب جاتا ہے۔۔۔ (۲۴)

نظم ''کبھی دیکھو'' میں زاہدہ زیدی نے روشنیوں میں رہنے والے لوگوں کو اپنے خول سے باہر نکل کر دیکھنے کی دعوت دی ہے۔ خوش حال طبقہ اپنی دُنیا میں مگن اپنے اردگرد پھیلی بدحالی کو دیکھنے کی زحمت نہیں کرتا۔ اس بدحالی کے راز سے پردہ اُٹھایا جائے تو اس کا سبب یہی خوش حال طبقہ ہے۔ صدیوں سے جاری اس ظلم کے نظام کے باعث تاریکیاں ہیں کہ بڑھتی چلی جارہی ہیں۔

زبیر رضوی نے جدید دور کے تقاضوں، بدلتے ہوئے زمانے کے ساتھ بدلتے ہوئے رویوں، برائی کو قبول کرلینے کے سمجھوتوں، مناظرِ فطرت سے لطف اندوزی، ماضی پرستی، رومانویت اور جنسیات جیسے موضوعات پر نظمیں لکھی ہیں۔ اس کے علاوہ ہندو مسلم فسادات کے نتیجے میں ہونے والی جانوں کے ضیاع پر اُن کے ہاں گہرے دُکھ اور رنج کا اِظہار ملتا ہے۔ گلوبلائیزیشن کے عمل سے ملکی اور علاقائی اقدار کے اندر بھی واضح تبدیلیاں آئی ہیں۔ پہلے مغرب میں مرد اور عورت کے آزاد تعلق کا رواج تھا۔ اب مشرق میں بھی لوگوں نے اس کو اپنانا شروع کردیا ہے۔ بھارت میں بننے والی اکثر فلموں میں بھی لڑکے لڑکی کے آزادانہ تعلقات میل جول اور مغربی کلچر کی یلغار کو دیکھا جاسکتا ہے۔ زبیر رضوی کی بعض نظمیں معاشرتی اقدار سے اسی طرح کی بغاوت کو پیش کرتی ہیں:

ہم بہت دِنوں سے بے نام رشتے کی / برہنہ ساعتوں میں جی رہے ہیں / ہماری بے نام
قربتوں کے ذکر سے / رشتوں محفوظ حصاروں میں سانس لینے والوں کی / زبانوں کا
ذائقہ کڑوا ہوگیا ہے / آنے والے دِنوں میں / ہمیں سنگسار کیے جانے کا خوف بھی /

ہماری چاہتوں کو کوئی نام دینے پر مجبور نہیں کر سکا / کہ ہم رشتوں کے محفوظ حصاروں
میں رہ کر / سانس لینے کو بزدلی سمجھتے ہیں (۲۵)

زبیر رضوی کی بعض نظمیں نوسٹلجیائی کیفیت کا اظہار کرتی نظر آتی ہیں۔ جنس کے حوالے سے احساسات جبلت انسانی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کم و بیش ہر اِنسان اِس کا اظہار کسی نہ کسی صورت میں کرتا ہے۔ زبیر رضوی کی کئی نظموں میں یہ موضوع برتا گیا ہے۔ زبیر رضوی نے اپنی نظموں میں عورت کے حوالے سے متضاد خیالات پیش کیے ہیں۔ جہاں وہ ایک طرف اُسے طوائف کے روپ میں بھی ایک وفادار اور محبت کرنے والی عورت کے رُوپ میں پیش کرتے ہیں جو ہر چہرے میں اپنے محبوب کا چہرہ دیکھتی ہے۔ وہیں دُوسری طرف عورتوں کی جنسی بے راہ روی اور بد چلنی کے حوالے سے اِس صنف پر طنز کے نشتر بھی برساتے ہیں۔ اس میں عورتوں کا ایسا کردار پیش کیا گیا ہے جو شوہروں سے خیانت کرتی ہیں۔ زبیر رضوی کی نظموں میں ہندو مسلم فسادات پر دُکھ کا اظہار بھی ملتا ہے۔

زبیر رضوی کی نثری نظموں میں ملکی حالات کی عکاسی اور مستقبل کی تصویر کشی بھی ملتی ہے۔ بھارت کی آبادی اسّی کروڑ سے زیادہ ہو چکی ہے۔ بڑھتی ہوئی آبادی، پابندیوں کے باوجود اسپتالوں میں ناجائز بچوں کی پیدائش میں اضافہ، سوشلزم کی قراردادوں کی بے توقیری بد دیانتی اور کرپشن جیسے موضوعات کو زبیر رضوی کی نظموں میں دیکھا جا سکتا ہے۔

شہریار کی نظموں میں نفرت کا لفظ بار بار دیکھنے کو ملتا ہے۔ اصل میں وہ معاشرے سے نفرت ختم کر کے پیار اور محبت کا دور دورہ دیکھنے کے متمنی ہیں۔ نفرتوں کے ماحول میں پروان چڑھنے والے کو کیا معلوم کہ محبت کیا ہوتی ہے اور اِس کے کیا تقاضے ہیں۔ اہلِ دُنیا کی محبت سے دُوری اور ناآشنائی کا اِظہار اس نظم میں دیکھا جا سکتا ہے:

محبت کا دعویٰ کرنا بے کار ہے / کہ اس کا مفہوم تم خود نہیں جانتے / اور شاید کبھی جان
بھی نہ پاؤ / تمھاری پہچان / صرف تمھاری نفرتوں سے ہو سکتی ہے / تو بتاؤ / تم کو کس
سے اور کتنی نفرت ہے / کہ ہم تمھارے وجود کو کوئی نام دے سکیں (۲۶)

آج دُنیا میں ہر طرف نفرتوں کے الاؤ جل رہے ہیں۔ ایک فرد دُوسرے فرد سے اور ایک قوم دُوسری قوم سے نفرت و حقارت کے جذبات رکھتی ہے۔ دُنیا کو اِن نفرتوں سے آزاد کر کے محبت و اُخوت کی فضا کو پروان چڑھانے کی ضرورت ہے۔ شہریار کی شاعری میں اس طرح کے منفی اور خود غرضی پر مبنی رویوں کے خلاف شدید ردِ عمل پایا جاتا ہے۔

سید صادق علی کی نثری نظموں کے موضوعات میں تنوع پایا جاتا ہے۔ اُنھوں نے فلسفہ و تصوف کے ساتھ ساتھ ہجر و وصال، دہشت گردی اور طبقاتی تضاد کے موضوعات پر بھی قلم اُٹھایا ہے۔ راہ بروں کی شاطرانہ چالوں اور مکاریوں سے بیزار ہو کر جنگل کے زمانے میں مراجعت کا موضوع بھی اُن کے ہاں ملتا ہے۔ ''سلسلہ'' میں شامل ایک نظم کے آغاز میں اُنھوں نے کہانی کے انداز میں بات شروع کی ہے۔ ''بوڑھے کہتے تھے'' کے الفاظ سے قاری کی توجہ پورے طور پر اس طرف مبذول ہو جاتی ہے کہ دیکھیں بوڑھے کیا کہتے تھے۔ پھر اگلی سطروں میں قیامت کے قائم ہونے کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ آخر میں جا کر نظم ایک موڑ کاٹتی ہے اور قاری پر یہ بات کھلتی ہے کہ کسی عزیزِ جاں کے گھر سے رُخصت ہونے سے شاعر نے قیامت برپا ہونے کے خوف ناک اور دہشت ناک منظر کا مشاہدہ کیا ہے۔

''کشاد'' میں صوفیانہ مضامین کئی نظموں میں بیان ہوئے ہیں۔ اس مجموعے کی پہلی نظم کا عنوان ہے ''مجذوب''۔ ایک میلے کچیلے چیتھڑوں میں ملبوس، بڑے بڑے چکٹ بالوں والا سر لیے، کیچ بھرے سرخ سرخ دیدے نچاتے ہوئے چلاّ چلاّ کر اپنی دھن میں مست کہے جا رہا ہے۔

جب اپنی زبان کی تُتلاہٹ پر قابو پا لو / تو سب سے پہلے اس لفظ سے ڈرو / جو حق نہ ہو / پھر نیام سے تلوار نکال کر / وسوسوں پر ٹوٹ پڑو / کہ یہ قدم روک لیتے ہیں / اندھیری سمتوں میں چمکتی / بے شمار طویل و مختصر خواہشیں / احتیاج کے قالب میں آ کر رجھاتی ہیں / کبھی ہم آغوش ہوتی / بستر پر لیٹ جاتی ہیں / بدن کے طلسمات میں اسیر کر کے / سفر کو حضر بنا دیتی ہیں (۲۷)

معاشرے میں پائی جانے والی دہشت گردی آج کے دور کا ناسور ہے۔ ہزاروں بے گناہ اور معصوم لوگ اس دہشت گردی کی بھینٹ چڑھ چکے ہیں۔ ''بچپن کی آنکھیں'' میں اسی طرح کی صورتِ حال کی ترجمانی کی گئی ہے۔ ''بچپن کی آنکھوں'' سے میں صادق نے اسی موضوع کو زیب قرطاس کیا ہے۔ معاشرے میں پائی جانے والی طبقاتی کش مکش بھی صادق کی نظموں کا موضوع ہے۔ امیر و غریب، آقا و غلام، حاکم و محکوم کے مابین حائل خلیج بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ کارخانوں میں کام کرنے والے مزدور کے خون پسینے سے صنعت کار کی مل کا پہیا گھومتا ہے۔ ایک کی قسمت میں زندگی کی بنیادی سہولتیں بھی نہیں تو دُوسرے کو دُنیا جہان کا ہر عیش میسر ہے۔ زیر دست طبقے کا کام ہی عرشی طبقے کی زندگی کو پر آسان بنانا رہ گیا ہے۔ اس نظم میں اسی طبقاتی تضاد کو نمایاں کیا گیا ہے:

اندھیرے کا آکار / کب تم نے دیکھا / کہ تم تو ہمیشہ / ہمارے بدن کی / جو ان ہڈیوں سے / نکالا ہوا / فاسفورس جلا کر / اُجالے میں چلتے رہے ہو (۲۸)

خلیل مامون کی نظمیں خاصی طویل ہوتی ہیں۔ ان میں عصری حسیت کی جھلک بھی ملتی ہے۔ جیسا کہ اُن کے ضخیم مجموعے ''لا الہ'' کے عنوان سے ظاہر ہے، وہ انسان کو انسان کی غلامی سے نجات دلوانا چاہتے ہیں۔ وہ زمانے

کے خداؤں کی نفی کر کے انسان کو صرف ایک اللہ کے در پر جھکنے کا پیغام دیتے ہیں۔ موجودہ نظام طاقت ور کو مزید طاقت ور بنا رہا ہے۔ غریب کی غربت کم ہونے کے بجائے بڑھتی جا رہی ہے۔ خلیل مامون کی ایک نظم "یہ نظام کبھی نہ بدلے گا" اسی عصری حسیت کی مثال کے طور پر پیش کی جا سکتی ہے۔

پولنگ بوتھوں پر / قطاریں ہمیشہ جمتی رہیں گی / ریاکار اُمیدواروں پر / مجبوری کی مہریں چھپتی رہیں گی / مفلوک الحال عوام / کبھی دُھوپ میں / تو کبھی بارش میں / کبھی قحط سے / تو کبھی کھانے میں ملے زہر سے / کبھی زلزلوں سے / تو کبھی / سیلاب سے مرتے رہیں گے / مگر یہ نظام کبھی نہ بدلے گا۔ (۲۹)

خلیل مامون کی کئی نظموں میں امارت اور غربت کا فرق واضح کیا گیا ہے۔ اِس طرح کی ایک نظم ہے "ہم ایک ہیں"۔ اِس نظم میں اُونچے اُونچے محلوں کی بلند و بالا دیواروں میں رہنے والوں، ایوانوں اور درباروں کے مکینوں کو ایک دُوسرے سے جدا جدا بتایا گیا ہے۔ ایک نظم "بے نام" میں اُنھوں نے دین کو محض عبادات اور رُسوم تک محدود کرنے پر طنز کیا ہے۔ مسلمانوں نے دین کی اصل رُوح کو پسِ پشت ڈال دیا ہے۔ خلیل مامون کو گھسی پٹی، پامال، مفلوک الحال اور دُکھی انسانیت سے پیار ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ مظلوم انسانوں کے دُکھ درد کا چارہ کیا جائے۔ اُن کے حالات کو تبدیل کیا جائے۔ خصوصاً بھارت میں اچھوتوں کے ساتھ ہونے والے غیر انسانی سلوک پر وہ برہم دِکھائی دیتے ہیں۔ اس کا عکس اُن کی کئی نظموں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ "امبیڈکر کی پکار" اسی سلسلے کی ایک نظم ہے۔ نظم "پرچھائیں کی تلاش میں" میں انسانی جنگ و جدل پر بات کی گئی ہے۔ خلیل مامون کی نظمیں اُن کے دِل کی پکار ہیں۔ اُنھوں نے اپنے مشاہدات و تجربات کو نظم کا رُوپ دِیا ہے۔ اُن کی نظمیں اُن کے سچے اور کھرے جذبات کی عکاس ہیں۔

جینت پرمار کا تعلق دلت خاندان سے تھا۔ ہندو اس طبقے کو اچھوت سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دلتوں کے ساتھ ہندوستان میں امتیازی سلوک کیا جاتا ہے۔ یہ بے چارے اِفلاس زدہ اور مفلوک الحال ہیں۔ جینت پرمار کی شاعری کی تفہیم کے لیے ہندوستان میں دلتوں کے ساتھ ہونے والے مظالم اور جینت کے خاندانی پس منظر کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔ جینت پرمار کو مصوری کا بچپن سے شوق تھا۔ اُنھوں نے اس شوق کو حصولِ رزق کا وسیلہ بھی بنایا، لیکن بعد میں ایک ناخوش گوار واقعے کی وجہ سے اسے پیشہ نہ بنایا۔ ہاں، یہ ضرور ہے کہ اُن کی شاعری میں الفاظ کی مصوری (امیجری) کے خوب صورت نمونے ملتے ہیں۔ جینت پرمار کو مصوری سے خاص لگاؤ ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ بہار کے موسم میں زمین کے کینوس پر ظاہر ہونے والے رنگ رنگ کے بیل بوٹے، خوش رنگ پھول اور سبزہ خدا کی۔

جینت پرمار نے دلت ذات کے افراد پر ہونے والے غیر انسانی سلوک کا مشاہدہ بلکہ تجربہ کیا ہے۔ وہ جب ان مشاہدات و تجربات اور حادثات و واقعات کی تصویریں کھینچتے ہیں تو ان میں تاریخِ انسانی کا سارا کرب جمع ہو جاتا ہے۔ پڑھنے والا خود کو اس منظر کا حصہ سمجھتا ہے۔ اُس کے دل میں بھی سماجی ناانصافی کے خلاف نفرت اور غصے کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں۔ اِس ضمن میں اُن کی نظم ''ذات۔ ۲'' کو دیکھا جا سکتا ہے۔

بھوکا برہمن / بھوکا کھشتریہ / بھوکا ویشیہ / لڑتا ہے روٹی کے لیے / چاند سی اک روٹی کے لیے / اس کا سپنا روٹی ہے / میرا سپنا روٹی نہیں / اچھوت ہوں مَیں / میرے سائے سے بھی تم کتراتے ہو / مَیں ہوں تمہاری بستی باہر / جہاں تم ہگتے ہو وہاں پر / ٹاٹ کی میری جھگّی ہے / کنویں سے لے کر مندر تک / تم نے بنائی ہیں دیواریں / منو کی اونچی دیواریں! / میرے حصّے میں تو ملا ہے / اپنے لوگوں کا ایمان! / اور نفرت کی آگ!! / مری جنگ ہے اُس کے خلاف / جو روٹی سے بڑھ کر ہے / میری جنگ روٹی کی نہیں!(۳۰)

''منو تری قسمت ہے کالی'' میں بھی جینت کمار نے دلت ذات کے افراد پر صدیوں سے روا رکھے جانے والے بہیمانہ مظالم کا درد انگیز حال بیان کیا ہے۔ ایک اور نظم ''کیفیت'' کی آخری سطروں میں بھی اُنھوں نے دلتوں کو پامال کیے جانے کا ذکر دردناک انداز میں کیا ہے۔ جینت پرمار کی نظم ''نرک کنڈ کی باس'' اُن کی نمائندہ نظموں میں سے ایک ہے۔ جو احتجاجی رنگ میں ہے۔ 'ہزاروں ہاتھ'' بھی اسی احتجاج کے سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اس میں دلت افراد کی خواہشات کے روندے جانے کا ذکر بڑے دردناک اُسلوب میں کیا ہے۔ جینت پرمار کی نظم ''صبح کی ہواؤ'' میں صدائے احتجاج بغاوت کا رُوپ دھار لیتی ہے۔ وہ ظلم و ناانصافی اور عدم مساوات پر مبنی نظام کے خلاف بغاوت کا اعلان کرتے ہیں۔ وہ ان ظالمانہ طاقتوں کو جلا کر خاکستر کر دینے کے درپے نظر آتے ہیں۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے اِس نظم کو اُردو کی موثر ترین دلت نظم قرار دِیا ہے۔ (۳۱)

جینت پرمار نے صرف دلت برادری کے لیے نظمیں نہیں کہیں، بلکہ ہر دُکھی اور مظلوم انسان پر اُن کا دِل خون کے آنسو رویا ہے۔ وہ احمد آباد میں پیدا ہوئے اور ساری عمر اِسی شہر میں گزاری۔ اس شہر میں ہونے والے مسلم کش فسادات پر وہ خاموش کیسے رہ سکتے تھے۔ اُنھوں نے ''شہر'' نامی نظم میں احمد آباد کے فسادات کے حوالے سے اپنے دُکھ کا اِظہار کیا ہے۔

صفیہ اریب کی نظمیں انسانی منافقتوں کی داستان سناتی ہیں۔ انسانی رشتوں کا کمزور پڑ جانا بھی اُن کی نظموں کا موضوع ہے۔ الفاظ سے لگنے والے گھاؤ بھی اُن کی نظموں کا موضوع بنتے ہیں۔ اُنھوں نے انسانی محرومیوں اور ناانصافیوں پر بھی قلم اُٹھایا ہے۔ ذیل میں دی گئی نظم میں اُنھوں نے اخلاص پر مبنی رشتوں کی موت کے المیے کا ذکر کیا

ہے۔خون سفید ہونے کا محاورہ تو عام طور پر سننے اور بولنے میں آتا ہے لیکن صفیہ اریب نے خون زہر آلود ہونے کی بات کی ہے۔ شاعرہ اس طرح کے بے شمار زہروں کا ذکر کرتی ہے جو طویل عرصے سے انسان کے تعاقب میں لگے ہوئے ہیں۔ پھر شاعرہ کی یہ خواہش بھی سامنے آتی ہے کہ جدید دور میں ہونے والی سائنسی ترقی کوئی ایسا فارمولا ایجاد کرے جو اِن زہروں کے تریاق کے طور پر کام کر سکے۔ اصل میں شاعرہ معاشرے میں پائی جانے والی بے حسی سے نالاں ہے۔ وہ انسانوں کے جسموں میں سرایت کرتے خود غرضی اور نفس پرستی کے ان زہریلے اثرات کا خاتمہ چاہتی ہے۔ اگر معاشرہ اِس سماجی پستی سے نکل آئے تو رُوئے ارضی آج بھی جنت کا نمونہ پیش کر سکتی ہے۔

کوئی نہیں جلتا / کسی کے لیے ______ یہ سب / دل کو منانے کی باتیں ہی / ہمارا خون
/ زہر آلود ہو چکا ہے / یہی خون ہمیں ورثے میں ملا ہے / زہر ______ لاتعداد ہیں
/ ان گنت صدیوں سے / پیچھا کر رہے ہیں / سائنس ______ کبھی تو / کوئی فارمولا /
بنائے گی / خون کو ______ زہر سے / آزاد کر کے چھوڑے گی (۳۲)

صفیہ اریب دُنیا میں ہونے والی جنگوں اور انتشار کا باعث الفاظ کو گردانتی ہیں۔ اس لیے شاعرہ خاموشی کو کلام پر ترجیح دیتی ہیں۔ آج کے انسان کا ایک مسئلہ انصاف کے حصول میں درپیش رکاوٹیں بھی ہیں۔ سماجی حوالے سے ہم جس طرح رسم و رواج کی جکڑ بندیوں میں گرفتار ہیں۔ خاص طور پر عورت کو چادر اور چار دیواری کے تقدس کے لیے اپنے فطری جذبات کی قربانی دینی پڑتی ہے۔ بیوہ عورت کے حوالے سے ہندو مذہب میں جو رسوم رائج رہیں۔ ایک نوجوان لڑکی بیوہ ہو جائے تو اس کو دوسری شادی کا حق نہیں۔ اگرچہ آج عورت کو ستی نہیں کیا جاتا اور نہ ہی آشرم بھیجا جاتا ہے۔ مگر آج بھی بیواؤں کو منحوس تصور کیا جاتا ہے۔ شادی بیاہ اور گود بھرائی جیسی رسوم میں بیواؤں کو شامل نہیں کیا جاتا۔ اس کے علاوہ تنہائی کا زہر بھی پل پل ایک بیوہ کا مقدر بنا دیا جاتا ہے۔ یہی وہ جدید اور نسائی حسیت ہے جس کا ذکر صفیہ اریب نے اس نظم میں کیا ہے۔

جسم کی نس نس میں / روایات کے / اجلے سفید پر / اُگ آئے ہیں / بھرپور جسم کو /
قد آدم / آئینے میں دیکھنا / بڑی جرات چاہتا ہے / پروں میں سر چھپا کر / سو رہی ہوں /
سونے دو! (۳۳)

لاکھوں کروڑوں انسانوں کے شہر میں رہنے کے باوجود خود کو تنہا محسوس کرتا ہے۔ کوئی نہیں جو آگے بڑھ کر اُس کی تنہائی کا مداوا کر سکے۔ اسی لیے وہ اپنی ایک نظم میں یہ کہتی دکھائی دیتی ہیں کہ "یہ صدی تنہائی کی صدی ہے۔"

اشتراکات و اختلافات

جب ہم پاکستان اور بھارت کے نثری نظم لکھنے والے نمائندہ شعرا کی تخلیقات کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں سرحد کے دونوں طرف کے شعرا میں متعدد موضوعات ایک جیسے ملتے ہیں جیسے دونوں ملکوں کے شعرا موجودہ دَور کے اِنسان کی فطرت سے بے توجہی اور دُوری پر نالاں اور فطرت کی طرف مراجعت کے آرزومند نظر آتے ہی۔ دونوں ملکوں کے شعرا نے صنعتی ترقی سے پیدا شدہ مسائل کو اپنی نثری نظموں کا موضوع بنایا ہے۔ ان میں دیہاتوں سے شہروں کی طرف منتقلی کا رُجحان، جسمانی تقاضوں کو پورا کرنے کی اندھی دوڑ میں رُوحانی مطالبوں کو یک سر بھول جانا۔ روحانیت سے دُوری کے سبب انسان کی اُلجھنوں اور پریشانیوں میں اضافہ ہونا۔ رشتوں کی پہچان اور تقدس کا خاتمہانا شامل ہیں۔ اس صنعتی ترقی کے نتیجے میں نفسیاتی مسائل بھی پیدا ہوئے ہیں جیسے تنہائی، منافقت، اخلاقی قدروں کا زوال ہے، سماجی اور معاشی ناانصافیاں، گلوبلائزیشن کے نقصانات دونوں ملکوں میں لکھی جانے والی نثری نظم میں ان مسائل کا بھرپور اظہار ملتا ہے۔ جہاں تک نثری نظم کے موضوعاتی اختلافات کی بات ہے پاکستان میں لکھی جانے والی نظموں میں اسلامی روایات اور اِسلامی تاریخ کے واقعات کا ذکر بھارت میں لکھی جانے والی نثری نظم کی نسبت زیادہ ملتا ہے۔ اسی طرح جمہوریت کی گاڑی بار بار پٹڑی سے اُترتی رہی۔ اس کے نتیجے میں پاکستان میں بار بار مارشل لا لگتا رہا۔ اس زمانے میں انسانوں کے بنیادی شہری حقوق معطل کیے جاتے رہے۔ پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا پر سنسر لگایا جاتا رہا۔ چناں چہ اس حبس زدہ موسم کا اظہار پاکستان میں لکھی جانے والی نثری نظم میں ملتا ہے۔ اسی طرح پاکستان ایک طویل عرصے تک دہشت گردی کی آگ میں جلتا رہا چنان چہ پاکستانی نثری نظم لکھنے والوں نے دہشت گردی کو اپنی نظموں کا موضوع بنایا۔ کراچی میں لسانی بنیادوں پر قتل و غارت گری کا بازار گرم رہا۔ یہاں بوری بند لاشیں ملنا معمول بن چکا تھا۔ شاعروں نے ان فسادات پر بھی دُکھے دِل کے ساتھ اظہارِ خیال کیا۔ اس کے علاوہ پاکستانی شاعروں نے ملکی و بین الاقوامی صورتِ حال خصوصاً کشمیر کے موضوع پر بھی نظمیں لکھی ہیں۔ امتِ مسلمہ کے ساتھ ہونے والے مظالم کو بھی نثری نظم کے پاکستانی شاعروں نے اپنی نظموں میں بیان کیا ہے۔ یوں تو بھارت میں بھی شاعرات نے نثری نظمیں لکھی ہیں لیکن اُنھوں نے نسائی حسیت کو اس طرح اپنی نظموں کا موضوع نہیں بنایا، جس طرح پاکستانی شاعرات نے اس موضوع کو برتا ہے۔ بھارتی نثری نظم کے نمائندہ شاعروں کی تخلیقات کا جائزہ لیا جائے تو اُن میں بھی عصری حسیت کے پرتو دیکھے جاسکتے ہیں اُن میں ہندووانہ معاشرے کے رسم و رواج مثال کے طور پر ہندومت میں بیوہ کے ساتھ ہونے والے ناروا اور غیر فطری سلوک، اسی طرح بھارت میں اقلیتوں کے ساتھ ہونے والی بدسلوکیوں کو بیان کیا ہے۔ پھر بھارت میں ہندو مسلم فسادات کے نتیجے میں بھی بے گناہ مسلمانوں کا

خون بہایا جانا ایک اہم موضوع ہے۔ اسی طرح بھارت میں لکھی جانے والی نثری نظموں میں بعض شعرا کے ہاں فلسفہ و تصوف کے مضامین بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ بھارتی نثری نظم لکھنے والوں میں سے بعض نے سیاسی اور نیم سیاسی موضوعات پر بھی قلم اُٹھایا ہے۔ اگرچہ بھارت دُنیا کی عظیم جمہوریت ہونے کا دعوے دار ہے تاہم نثری نظم کے بعض شاعروں نے بھارت کے انتخابی نظام کی خرابیوں کے حوالے سے بھی نظمیں لکھی ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ قمر جمیل، (۱۹۸۵ء)، چہار خواب، مکتبہ آسی، کراچی، ۱۹۸۵ء، ص ۱۴۶۔۱۴۷

۲۔ انیس ناگی: روشنیاں-https://bookkorner.blogspot.com/2017/02/roshniyan-by-anees ص ۱۹۔۲۰

۳۔ احمد ہمیش، ہمیش نظمیں، تشکیل پبلشرز، کراچی، ۲۰۰۵ء، ص ۵۷

۴۔ ایضاً ص ۲۵ ۵۔ ایضاً ص ۸۰

۶۔ کشور ناہید، گلیاں، دُھوپ، دروازے، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۷۸ء، ص ۱۹

۷۔ کشور ناہید، (۱۸۹۱ء) ملامتوں کے درمیاں، مکتبہ عالیہ، لاہور، ص ۱۴۰۔۱۴۱

۸۔ افضال احمد سیّد، مٹی کی کان، سٹی بک شاپ، کراچی، ۲۰۰۹ء، ص ۲۶۔۲۷

۹۔ طارق ہاشمی، اُردو نظم اور معاصر انسان، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۵ء، ص ۱۲۹

۱۰۔ افضال احمد سیّد، مٹی کی کان، محولہ بالا ص: ۲۱۰

۱۱۔ عذرا عباس، میز پر رکھے ہاتھ، جدید کلاسیک پبلشرز، کراچی، دُوسری اشاعت ۱۹۹۱ء، ص ۲۰۔۲۱

۱۲۔ ایضاً ص ۲۲

۱۳۔ سارا شگفتہ، آنکھیں، تشکیل پبلی کیشنز، کراچی، ۱۹۸۴ء، ص ۱۹

۱۴۔ نصیر احمد ناصر، ایک تصویر زا نظم کا اسپکٹروگرام مشمولہ تیسرے قدم کا خمیازہ، سانجھ پبلی کیشنز، لاہور ۲۰۱۳ء، ص ۳۰

۱۵۔ نصیر احمد ناصر، سرمئی نیند کی بازگشت میں، بک کارنر، جہلم ۲۰۱۷ء، ص ۴۷

۱۶۔ علی محمد فرشی، محبت سے خالی دنوں میں، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۶ء، ص ۱۹۔۲۰

۱۷۔ تنویر انجم، ان دیکھی لہریں، تشکیل پبلشرز، کراچی، ۱۹۸۲ء، ص ۱۴۹۔۱۵۰

۱۸۔ ذی شان ساحل، اگر آپ، مشمولہ ساری نظمیں، آج کی کتابیں، کراچی، ۲۰۱۱ء، ص ۲۵۹

۱۹۔ خورشید الاسلام، جستہ جستہ، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی، بارِ اوّل دسمبر ۱۹۷۷ء ص ۱۱

۲۰۔ ایضاً ص ۱۱۲ ۲۱۔ ایضاً ص ۱۴۰

۲۲۔ محمد حسن، ڈاکٹر، خواب نگر، تخلیق کار پبلشرز، دہلی ۲۰۰۷ء، ص ۳۹

۲۳۔ باقر مہدی، سیاہ / سیاہ، اظہار۔ روی درشن، آف کارٹر روڈ، باندرہ، بمبئی ۱۹۹۳ء، ص ۱۴۹

۲۴۔ زاہدہ زیدی، شعلۂ جاں، آبشار پبلشرز، سرسید نگر، علی گڑھ، جنوری ۲۰۰۰ء، ص ۱۴۰

۲۵۔ زبیر رضوی، پورے قد کا آئینہ، ذہنِ جدید، نئی دہلی ۲۰۰۴ء، ص ۲۰۷

۲۶۔ شہریار، ساتواں در، شب خون کتاب گھر، الہ آباد اکتوبر ۱۹۶۹ء ص ۱۰۵

۲۷۔ صادق، کشاد، عیار پبلی کیشنز، نئی دہلی ۱۹۹۲ء، ص ۱۳

۲۸۔ ایضاً ص ۹۵

۲۹۔ خلیل مامون، لاالہ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۲۰۱۸ء، ص ۵۵

۳۰۔ جینت پرمار، مانند، سخن کدہ، احمد آباد ۲۰۰۷ء، ص ۷۱

۳۱۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ایزل پر رکھی شبد نظمیں، مشمولہ پنسل اور دُوسری نظمیں سخن کدہ، احمد آباد ۲۰۰۶ء ص ۲۴

۳۲۔ صفیہ اریب، نثری نظم مشمولہ ''اظہار'' (چوتھی کتاب)، اگست ۱۹۷۸ء، ص ۳۵۰۔۳۵۱

۳۳۔ ایضاً ص ۳۵۳

Hawala Jaat

1.Qamar Jameel , (1985), chahar khawab, maktaba Asee , Karachi,1985,s 146,147.
2. Anees naqe : roshniyan https : / / bookkorner. blogspot. com / 2017 / 02 / roshniyan-by-anees S 19,20.
3. Ahmed Hamesh , Hamesh nazmein, tashkeel publishers, Karachi,2005,s 57.
4.Ayzan, S 25.
5.Ayzan, S 80.
6.Kiswar naheed,galiya,dhoop,darwazy,maktiba Aliya,Lahore,1978,s 19.
7.kiswar naheed,(1891)malamton k darmayan, maktiba aliyaa,Lahore,s 140,141.

8.Afzal ahmed syed, mati ki kaan,city book shop,krachi,2009,s 26,27.
9.Tariq hasmi,urdu nazam ur maesry insan,porab acdemy,Islamabad,2015,s 129.
10.Afzal ahmed syad,mati ki kaan, mahwala bala s: 210.
11.Azra abbas,Meaz par raky hath,jaded classic publishers,Karachi,dosri asaat,1990,s 20,21.
12.ayzan,s 22.
13.sara sagofta,ankhen,tasqeel publications,Karachi,1984,s 19.
14.naseer ahmed nasir,aik tasveer za nazam ka aspektrogaram masmula tesray qad ka khamyaza, sanjh publications,Lahore,2013,s 30.
15.naseer ahmed nasir , surmae nend ki bazgasht men,book corner,jehlum,2017,s 72.
16.Ali Muhammad farsi,muhabat se khali dino men,misaal publishers,faislaabaad,2016,s 19,20.
17.tanveer anjum,an deki lehren,tashkeel publishers,Karachi,1982,s 149,150.
18.zeeshan sahil,ager aap,masmula sari nazmeen,aaj ki kitaben,Karachi,2011,s 259.
19.khurseedul islam,jasta jasta,maktiba jamia limited,jamia nagar,nae deli,bary awal December,1977,s 11.
20.Ayzan, s 112.
21.Ayzan, s 140.
22. Muhammad hassan,docter,khwaab nagar,takhleeq kaar publishers,deli,2007,s 39.
23.baqar Mehdi,sayah/sayah,izhaar-rawi darsan,of cartor road,bandra,mumbai1993,s 149.
24.zahida Zaidi,sulae jaan,absaar publishers,sir syad nagar,ali ghar,junwery 2000, s 140.
25.zubeer Rizvi,poray qad ka ayeina,zehny jaded,nae deli,2004,s 207.
26.sehryar,satwa dar,saabe khoon kitaab ghar,ilaah abaad octber 1969, s 105.
27.sadiq,kusaad,eyaar publications,nae deli,1992,s 13.
28.Ayzan, s 95.
29.khalil mamoon,laa ilaha,educational publitioning house,deli 2018,s 55.
30.jeniyat parmaar,mannd,sukan kada,ahmed abaad 2007,s 71.
31.docter gopi chand narang,eyzal par raki subd nazmeen,masmula pencil aur dosri nazmeen sukan kada,ahmed abaad 2006,s 24.
32.safia areeb,nasri nazam masmula “izhaar” (chooti kitab),august 1978,s 350,351.
33.Ayzan, s 353.